

موباساں، فرانس کا نام ور قلم کار، دنیا کے چند یادگار فنکاروں میں ایک۔ 5 اگست 1850ء، فرانس میں پیدا ہوئے، گیارہ سال کی عمر میں باپ کی علیحدگی کی وجہ سے نامساعد حالات، چرچ میں ابتدائی تعلیم، 13 سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لیے خانقاہ کا رخ، خانقاہ کی یکساں زندگی سے وحشت اور اپنی خاص سرکشانہ افتاد طبع کے غیاز سے 1868ء، 18 سال کی عمر میں خانقاہ بدری۔ لی ہاروے کا سفر اور دوسرے سال یونیورسٹی کی ڈگری۔ 1869ء، پیرس میں قانون کی تعلیم اور فرانکو پروشین جنگ سے تعلیم میں رخنہ، تعلیم ادھوری چھوڑ کے فوج میں بھرتی اور جنگ میں محاذ پر شرکت۔ جولائی 1871ء میں جنگ سے واپسی، دوبارہ قانون کی تعلیم اور باپ کی سفارش پر وزارت تعلیم میں ملازمت۔ خانہ آبی بلکہ ماں کے خاص تعلق خاطر کے پس منظر میں فرانس کے مایہ ناز ادیب فلاہیر کی خدمت میں حاضری اور لب کی طرف رغبت، فلاہیر کی شفقت آمیز نگرانی میں درس و تدریس کا سلسلہ اور فرانس کے نامی گرامی ادیبوں سے ربط ضبط۔ 1880ء مشفق و محسن استاد فلاہیر سے محرومی اور ادب کا سلسلہ شدومد سے جاری۔ سرکاری ملازمت میں وقت کی ارزانی اور کوچ گردی و دوست نوروی، ویزا سمندر سے عشق، کشتی رانی کا خاص شوق، پری جمالوں کا تعاقب، فرانس کے اخبارات میں مضامین اور کہانیوں کی مستقل اشاعت، 1880ء سے 1890ء تک شب و روز تخلیقی کام، 300 مختصر کہانیاں، 6 ناول، 2 سفر نامے اور شاعری کی ایک کتاب، ناول ”بل ایلی“ سے دولت کی فروانی۔ شر کے فیشن ابل ملاتے میں ایک فلیٹ اور ہمہ وقت خوش اندام خواتین کی محفل آرائی۔ بچپن سے سقلس کا غار نہ اور بے توجہی۔ اسی مرض میں دو بھائیوں کی موت، 1884ء میں اعصابی انحطاط، خفقانی دورے، 1891ء میں مکمل حواس باختگی اور نئے نوریم میں داخلہ۔ اپنی بیماری کی شدت میں خودکشی کی کوشش، 43 سال کی عمر میں قصہ زندگی تمام۔

موباساں کو صرف 43 سال ملے اور کہتے ہیں، آخری 13 برسوں میں تین برس وہ بیمار رہا۔ اس سے پہلے کے صرف دس برسوں میں اُس نے اتنا بڑا اور اہم تخلیقی کام کیا ہے۔ اس کے لیے تحقیق کیا۔ یہ کیسا ستم ہے کہ آدمی مر جاتا ہے۔ تن آور، قد آور، آدمی کوئی بھی ہو، آدمی مر جاتا ہے۔ موت کسی میں تنہا نہیں کرتی۔ دوامی زندگی نہیں تو اس شخص کو کچھ زیادہ سہولت ملنی چاہیے جو احساس جگاتا، سایہ دیتا اور فکر پر اکساتا ہے۔ جو رنگوں اور پتروں سے نت نئے پیکر تراشتا ہے اور نئے بکھیرتا ہے۔ موباساں کو کچھ اور وقت مل جاتا تو جہانے اور کتنی آئینہ نما تحریریں ہماری دست رس میں ہوتیں۔ موباساں کے افسانوی تہکات میں سے یہ دو کہانیاں سب رنگ زدگار کی نذر ہیں۔

نادرہ کار موباساں کے نوادر خانے سے دو مختصر مختصر کہانیاں

ایک عورت کے کہانے اُس کے پاس سے کوئی کنارہ نہیں رہا تھا

ترجمہ * نگہت خانہ



ہاں، آپ مسلسل اُسی کو دیکھتے رہتے ہیں، اُس کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ یہ کون ہے؟ کیا ہے؟ کہاں ہے؟ اُسی سے آ رہی ہے؟ جانا کہاں ہے؟ آپ اپنے دماغ میں اُس کے ساتھ رومان کا ایک نقشہ ترتیب دیتے ہیں۔ یہ خوب صورت ہے، دلکش ہے، اس کے ساتھ زندگی کتنی اچھی گزر سکتی ہے۔ کون جانے، شاید یہی وہ عورت ہو جو میرے جذبات سمجھ سکے۔ شاید میں اب تک اسی کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ ممکن ہے، یہی میرے خوابوں کی تعبیر ثابت ہو۔ پھر وہ بچپن کا بھی کتنا یادگار ہوتا ہے جب آپ اُسے کوچ سے اترتے دیکھتے ہیں۔ جب آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ٹھیکل دو جیہ شخص اُسے خوش آمدید کہتا ہے اور دو پھول سے بچے اُس سے چٹ جاتے ہیں۔ قلی سامان اُتارتا ہے تو وہ شخص آگے بڑھ کر سب کچھ سنبھال لیتا ہے۔

الوداع، ہلڈ بائی۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اب آپ اُسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ اُس حسین عورت کو آخری سلام جو رات بھر آپ کے پہلو میں بیٹھی رہی تھی۔ اب آپ اُسے کبھی نہیں جانیں گے، اُس سے کبھی گفتگو نہیں کر سکیں گے۔ آپ اُداس ہیں، ایک اجنبی سے پچھرتے ہوئے آپ کو احساس ہو رہا ہے جیسے آپ نے کچھ کھو دیا ہے۔ خدا حافظ۔

سب رنگ

سفر کا سب سے دلچسپ پہلو مختلف لوگوں سے ملنا ہوتا ہے۔ یہ اتفاقی ملاقاتیں کبھی کبھی پورا سفر یادگار بنا دیتی ہیں۔ کون واقف نہیں کہ جب ہم میلوں کا سفر طے کر کے اپنے عزیزوں یا دور طالب علمی کے پرانے دوستوں سے ملاقات کرتے ہیں تو کیسی خوشی ہوتی ہے۔ ماضی کی یادیں ہماری عمر ایک بار پھر برسوں پیچھے دھکیل دیتی ہیں۔ نہ جانے کتنوں نے سفر کی راتیں رت جگوں میں بسر کی ہوں گی۔ کسی دور افتادہ گاؤں میں جہاں ابھی اسٹیم انجن نہیں پہنچا ہے۔ تمام رات کوچ کا سفر، اور کوچ کے سفر میں بارہا کسی خوب صورت خاتون کی ہم سفری، کوچ کی غیالی روشنی میں اُس کی غیند سے بوجھل آنکھیں۔ وہ حسن جو تمام راستے صرف جھٹک دکھاتا رہتا ہے۔ وہ حسن جو راستے میں کہیں سے دفعۃً سوار ہو کے آپ کا ہم سفر بن جاتا ہے اور جب سحر نمودار ہونے لگتی ہے، ذہن اور آنکھیں ابھی تک غیند کے زیر اثر ہوتی ہیں، کتنا اچھا لگتا ہے، اپنی ہم سفر کو غیند سے بیدار ہوتے دیکھنا۔ پھر وہ اپنے سر پا پر ایک نظر ڈالتی ہے، اپنے بے ترتیب لباس اور خود سر بال اپنی نفیس انگلیوں سے درست کرتی ہے۔ وہ آپ پر بھی ایک سرد نگاہ ڈالتی ہے، پھر اپنی نشست پر محتاط ہو کر بیٹھ جاتی ہے اور یہ یاد کر لیتی ہے کہ اُس کی توجہ آپ پر نہیں بلکہ راستے کے قدرتی مناظر پر ہے۔



پہلو سے کہا فے

حالانکہ اُس وقت میں خود ایک آوارہ گرد تھا، یہ کون ہے؟ اس کی زندگی میں کیا واقعات رونما ہوئے ہیں؟ یہ اکیلی ان تکلیف دہ پہاڑی سلسلوں میں کیوں گھوم رہی ہے؟ میں ابھی اُس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اُس نے کھانا ختم کیا اور بل ادا کر کے شال درست کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

باہر ایک گاؤں اُس کا منتظر تھا۔ میں اُن دونوں کو دُور تک واوی کی جانب جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ عورت قد میں گاؤں سے نکلتی ہوئی تھی اور اُس سے زیادہ تیز قدموں سے چل رہی تھی۔

دو گھنٹے بعد میں درختوں سے گھرے ہوئے ایک وسیع سبزہ زار میں ٹہل رہا تھا۔ سبزہ زار کے کنارے کنارے شفاف دریا بہہ رہا تھا۔ منظر اتنا خوش نما تھا کہ وہیں بیٹھ جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ معاً میں نے اُسی عورت کو دیکھا۔ وہ دریا کے کنارے نظر سے نیچی کیے ایک مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ وہ دریا کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے اُس کی گہرائی میں کچھ تلاش کر رہی ہو۔ میں اُس کے قریب سے گزرا تو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی آنکھوں میں آنسو چل رہے ہوں۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے درختوں کے قریب کھڑے ہوئے گاؤں کی طرف چلی گئی۔

دوسرے دن شام کے وقت میں سیورولز کے قلعے کی سیر

میری یادداشت میں سفر کے ایسے کئی لمحے محفوظ ہیں جو آج بھی مجھے ایک سرور انگیز بے چینی عطا کرتے ہیں۔

اُن دنوں میں فرانس کے ایک دُور دراز پہاڑی سلسلے میں پیدل سفر کر رہا تھا۔ یہ سلسلہ نہ بہت اونچا تھا نہ ہی بگڑا۔ میں نے ابھی ایک مختصر پہاڑی عبور کی تھی اور اب ایک چھوٹے سے ریستوراں میں داخل ہو رہا تھا۔ میری نظر ایک ضعیف عورت پر پڑی۔ ایک اجنبی، کوئی قابل ذکر شخصیت بھی نہیں۔ وہ تنہا ایک میز پر بیٹھی لچ کر رہی تھی۔

کھانے کا آرڈر دے کے میں نے اُسے ذرا غور سے دیکھا۔ اُس کی عمر تقریباً ستر سال ہوگی۔ ٹکٹا ہوا قد۔ جوانی کی دل کشی کے آثار اب بھی اُس کے چہرے پر نظر آرہے تھے۔ سفید بال سلیقے سے پرانے فیشن کے مطابق بنائے گئے تھے۔ اُس کا لباس انگریز سیاح عورتوں جیسا تھا۔ یہ لباس اُس کی شخصیت سے قدرے مختلف تھا، جیسے اب لباس کی اُس کی نظر میں زیادہ اہمیت نہ رہ گئی ہو۔ وہ آلیٹ کھا رہی تھی اور اُس کی میز پر شراب کی جگہ پانی تھا۔ اُسے دیکھ کر ایک قدیم روایتی خاتون ذہن میں ابھرتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں بے چینی تھی اور چہرے پر حواشی زمانہ کے زخم صاف نظر آتے تھے۔ میں نے اُسے بہت غور سے دیکھا،

کر رہا تھا۔ یہ قدیم قلعہ داوی کے درمیان ایک اونچے نیلے پر ایک دیو ہیکل مینار کی طرح کھڑا تھا۔ ڈوبتے سورج کی سرخ فلفلے کا منظر سحر انگیز بنا رہی تھی۔ یہ قلعہ ان کھنڈروں میں سب سے زیادہ قابل دید تھا۔ قلعے سے اب بھی شکوہ اور جاہ و جلال ٹپکتا تھا جیسے موت کی ابدی نیند سوئی ہوئی کوئی ملکہ۔

سیاح ایک ڈھلان سے گزر کے ایک چھوٹے دروازے سے اندر جاتے تھے اور آگے چل کر قلعے کی دیوار تک پہنچتے تھے۔ اندر شکستہ کمرے تھے اور پرانے نقش و نگار والی نیم شکستہ دیواریں تھیں۔ وہاں جگہ جگہ گھاس اگ آئی تھی۔ نہ معلوم کتنے بے شمار انسانوں کی شب و روز محنت کے بعد ترشے ہوئے پتھروں سے یہ دیو ہیکل قلعہ تیار ہوا ہو گا اور اب جنگلی جانوروں، خود رو سبزے کی آماج گاہ بن گیا ہے۔

میں اکیلا کھنڈروں میں گھوم رہا تھا۔ اچانک ایک دیوار کے پیچھے مجھے کسی سائے کا گمان ہوا اور کسی ہیولے کی جھلک دکھائی دی جیسے اس دیران قلعے کے کسی مکین کی بے چین روح ہو۔ میں کچھ ڈرا لیکن پھر ایک دم میرا ڈر جاتا رہا۔ میں نے اُسے پہچان لیا، یہ وہی عورت تھی۔

وہ رو رہی تھی، زار و قطار رو رہی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں رُومال تھا جس سے وہ بار بار آنسو پونچھتی۔ میں نے لوٹ جانا مناسب سمجھا لیکن ابھی میں پلٹنے ہی والا تھا کہ اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”ہاں موسیو! میں رو رہی ہوں لیکن ہمیشہ نہیں روتی، ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔“

”معاف کیجیے گا خاتون! میں آپ کی خلوت میں مغل ہوا۔“ میں شرمندگی سے ہکھلانے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ ”ہاں.... نہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”میری حالت ایک گم شدہ کتے کی طرح ہے۔“

وہ رُومال آنکھوں پر رکھ کے ہچکیاں لینے لگی۔ میں گھبرا گیا۔ بوکھلاہٹ میں، میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اُسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ اُس کی آنکھ باری سے مجھے اُس کے ساتھ ہم دردی ہو گئی تھی۔ میرے ہاتھوں کی مخلصانہ گرمی نے شاید اُسے تسلی دی۔ اُس نے اپنی آنکھیں صاف کیں، خود پر قابو پایا اور اپنی زوداد سنانے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنا غم کسی دوسرے کے ساتھ بانٹنا چاہتی ہے۔ جیسے غم کا بوجھ تنہا سہارا اب اُس کے لیے مشکل ہو۔

”آہ، آہ موسیو! اگر آپ جان لیں کہ میں کس عذاب.... کس اذیت میں زندہ ہوں....“

”یادش بخیر، ایک زمانہ تھا کہ میں بہت خوش و خرم تھی،

میرا اپنا ایک گھر تھا، میرے اپنے شہر میں لیکن اب میں وہاں، اپنے گھر جانا نہیں چاہتی۔ وہاں وقت گزرا تا کہ بے ناک ہے کہ اب میں ہمیشہ سفر میں رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ میں خاموشی سے سُن رہا تھا۔ ”میرا ایک بیٹا تھا، میرے اس حال زار کی وجہ وہی ہے، اُسی کے باعث میں اس حالت کو پہنچی ہوں مگر آہ، بچے کچھ نہیں جانتے، کچھ نہیں جان سکتے۔ انسان کے پاس خوشی کا کتنا مختصر وقت ہوتا ہے۔ میں اگر اپنے بیٹے کو اب دیکھوں تو شاید ایک نظر میں اُسے پہچان بھی نہ سکوں۔“

”آف، میں اُس سے کتنا پیار کرتی تھی، کتنا چاہتی تھی اُسے، جب وہ پیدا نہیں ہوا تھا تب بھی میں نے اُسے اپنے آپ میں حرکت کرتے محسوس کیا تھا۔ میں اُسی وقت اُس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ شاید سب مائیں ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔ پھر جب وہ پیدا ہو گیا تو میں اُسے اپنے جسم کا حصہ بنائے رکھتی، ہر وقت اُسے سینے سے لگائے رہتی۔ اُسے ہنساتی، بہلاتی، پوری پوری رات جاگ کر اُسے سوتے ہوئے دیکھتی رہتی، اُسی کے بارے میں سوچتی رہتی۔ لوگ مجھے دیوانی سمجھتے، میرا مذاق اڑاتے لیکن میں ایک بلی بھی اُسے خود سے جدا نہ کرتی۔ میں نے اُس کے بغیر کہیں آنا جانا ترک کر دیا۔ کیا کرتی، اُس سے الگ ہو کر مجھے چین ہی نہیں آتا تھا۔“ وہ آٹھ سال کا ہوا تو اُس کے باپ نے اُسے بورڈنگ میں داخل کرادیا، اس کے بعد سب کچھ ختم ہو گیا۔ وہ میرا نہیں رہا۔ وہ میرے خدا! وہ صرف اتوار کو آتا اور بس۔

”پھر وہ پیرس چلا گیا۔ وہاں کالج میں اُس کا داخلہ ہو گیا۔ اب وہ سال میں صرف چار مرتبہ آتا۔ میں ہر دفعہ اُس میں نمایاں تبدیلی دیکھتی۔ ہر بار وہ کچھ زیادہ بڑا ہو جاتا۔ میں اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے بڑھتے اور پھلتے پھولتے نہیں دیکھ رہی تھی۔ ہر بار وہ جب بھی آتا، پہلے سے بدلا ہوا لگتا۔ اب وہ چپہ نہیں تھا، لڑکا تھا۔ میں اُس کا بچپنا گھونٹتی تھی، یہ دولت مجھ سے لوٹ لی گئی تھی۔ وہ میرے سامنے پلٹتا تو مجھ سے مانوس ہوتا۔ اُس کا جو یقین مجھ پر مستحکم ہو سکتا تھا، وہ مجھ سے چھین لیا گیا کیوں کہ اب وہ میرے ہاتھوں پرورش نہیں پا رہا تھا۔ اگر وہ میرے ساتھ ہی رہتا تو جو محبت اسے مجھ سے ہوتی، وہ اتنی آسانی سے نہیں بھٹائی جاسکتی تھی۔ اُسے جوان ہوتے دیکھ کر مجھے جو خوشی ملتی، وہ میرا سر ملیہ حیات ہوتی۔ میری وہ خوشی بھی مجھ سے چھین لی گئی۔ میرا بیٹا اپنے آپ بڑا ہو رہا تھا، اپنی ماں کے سارے کے بغیر۔“

”میں اُسے سال میں صرف چار بار دیکھتی تھی۔ ذرا غور کرو، ہر دفعہ اُس کی آمد پر اُس کا جسم، اُس کی آنکھیں، اُس کی سب سے

حکمتیں، اُس کی آواز، اُس کی ہنسی وہ نہیں رہتی تھی جو گزشتہ آمد کے موقع پر ہوتی تھی۔ ہر دفعہ وہ نیا بن کر آتا۔ ایک بچہ اتنی تیزی سے اپنے اندر تبدیلی لاتا ہے، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اور ایسی صورت میں کہ میں اپنے بچے کی نشوونما دیکھنے کے لیے اُس کے پاس نہیں تھی۔ اود خدا، یہ اتنا دکھ دینے والا عمل ہے جو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آپ جو کچھ کھو دیتے ہیں، وہ کسی طرح لوٹ کر نہیں آسکتا۔

”ایک سال وہ آیا تو اُس کے گالوں پر بال آگئے تھے۔ وہ! میرا بیٹا! میں حیرت زدہ رہ گئی، اور تم یقین کرو، غم زدہ بھی ہوئی۔ میں اُسے سینے سے لگانے، اُسے پُوسنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرنے لگی۔ کیا یہی میرا ننھا سا، مناسب بچہ ہے، میری کوکھ سے جنم لینے والا جس کے سر پر ملائم ملائم کھڑکیا لے بال تھے۔ میرا پیارا بیٹا، میرے جگر کا ٹکڑا جسے میں ایک کپڑے میں لپیٹ کر اپنے گھٹنوں پر سلاتی تھی، جس نے میری چھاتی سے میرا دودھ پیا تھا۔ میں آج بھی اپنے سینے پر اُس کے نرم نرم بھوکے ہونٹوں کی گدگدی محسوس کرتی ہوں۔ یہ طویل قامت نوجوان نہیں جانتا کہ اپنی ماں کو کیسے پیار کیا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے صرف اس لیے محبت کرتا ہے کہ یہ اُس کا فرض ہے۔ ذرا غور کرو، وہ اپنی ماں سے محبت ایک ڈیوٹی سمجھ کر کرتا تھا۔ وہ مجھے ماں کہہ کر صرف اس لیے پکارتا تھا کہ یہی روایت تھی، وہ صرف میری پیشانی کا بوسہ لیتا تھا جب کہ میں اسے ہانہوں میں بھینچنے کے لیے بے تاب رہتی تھی۔

”میرے شوہر کا انتقال ہو گیا، پھر میرے ماں باپ کی باری آئی، پھر میں اپنی دو بہنوں سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ موت کسی گھر میں داخل ہوتی ہے تو کوشش کرتی ہے کہ جلد از جلد زیادہ سے زیادہ کام ختم کر لے تاکہ پھر ایک طویل مدت تک اُسے دوبارہ نہ آنا پڑے۔ پورے خاندان میں وہ صرف ایک یا دو افراد اس لیے زندہ چھوڑ جاتی ہے کہ وہ اپنے پیاروں کی یاد میں زندگی بھر روتے رہیں۔

”میں بھی تنہا زندہ رہی، میرا جوان بیٹا بہت فرض شناس تھا۔ میں نے سوچا، اُس کی قربت میں میری زندگی گزر جائے گی اور اسی قربت میں، میں مر جاؤں گی۔ اپنی باقی زندگی گزارنے کے لیے میں اُس کے پاس چلی گئی، لیکن اب وہ ایک نوجوان مرد ہو چکا تھا، اُس کے اپنے مشاغل تھے، اپنی مصروفیات تھیں، اُس نے مجھے یہ احساس دلانا شروع کر دیا کہ میں اُس کے ساتھ رہ کر اُس کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہوں۔ آہ، میں کتنی دُور سے اُس کے پاس گئی تھی مگر یہ میری غلطی تھی۔ میں، اُس کی ماں، اُس کے گھر پر زبردستی قابض تھی۔ آخر میں وہاں سے لوٹ آئی۔ اس

کے بعد میں نے اُسے زیادہ نہیں دیکھا، نہ دیکھنے کے برابر دیکھا۔ ”اُس نے شادی کر لی، میں بہت خوش تھی۔ ماں بھی عجیب ہوتی ہے۔ اولاد کی طرف سے ہمیشہ خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ اب ہم پھر ایک ساتھ رہ سکیں گے۔ میں اپنے پوتے، پوتیوں کے ساتھ کھیلوں گی، تھکے تھکے گلابی گلابی روٹی کے گالے اپنی گود میں پروان چڑھاؤں گی۔ میں وہاں بچتی۔ اُس کی بیوی ایک انگریز لڑکی تھی، وہ روزِ اوّل سے مجھے ناپسند کرتی تھی۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ وہ بھتی تھی، میں اُس کے شوہر کو اُس سے زیادہ چاہتی ہوں۔ اس طرح ایک دفعہ پھر مجھے اُس کے گھر سے نکلنا پڑا، میں ایک بار پھر تنہا رہ گئی۔ ہاں موسیو! میں ایک بار پھر بالکل تنہا رہ گئی تھی۔

پھر وہ انگلستان چلا گیا، اپنی بیوی کے والدین کے پاس۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ رہنے لگا۔ میں نے حسرت سے سوچا، اب وہ اُن کا ہو کر رہے گا۔ جیسے وہ میرا نہیں، اُن کا بیٹا ہو۔ انہوں نے اُسے مجھ سے چھین لیا، پُرا لیا۔ وہ وہاں سے ہر ماہ مجھے خط لکھتا۔ شروع شروع میں کبھی کبھی وہ مجھ سے ملنے بھی آتا لیکن اب اُس نے آنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔

”اب مجھے اپنے بیٹے کو دیکھے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں۔ آخری بار جب میں نے اُسے دیکھا تھا تو اُس کے چہرے پر حقیریاں سی پڑنے لگی تھیں اور بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ میں اُسے اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا یہ آدمی، یہ تقریباً بوڑھا آدمی میرا بیٹا ہے! ماضی کا چھوٹا سا گلابی گلابی گل کو تنہا سا....

”اب میں شاید اُسے کبھی نہ دیکھ سکوں۔ اب میں اپنا تمام وقت سفر میں گزارتی ہوں، کبھی مشرق میں، کبھی مغرب میں، بالکل تنہا، جیسے تم دیکھ رہے ہو۔“

اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”گڈ بائی موسیو!“ مجھے رخصت کر کے وہ وہیں راستے میں کھڑی رہ گئی، میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ کچھ دُور بعد میں نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ ایک نیلے پر کھڑی دُور آفتاب میں دیکھ رہی تھی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو، تیز ہوا سے اُس کے کندھے پر پڑی ہوئی شال کا ایک ہر اور اُس کے اسکرٹ کا نچلا حصہ کسی جھنڈے کی طرح لہرا رہا تھا۔

